کالم نگار کا منصب

ایک فارسی مصرعہ ہے، ''کسے کہ کشتہ نہ شُد، از قبیلہء ما نیست''۔ محترمہ روبینہ فیصل کی کتاب کی اس تقریب میں یہ مضمون تحریر کرتے وقت مجھے یہ مصرعہ بھی یاد آیا اور پاکستان کی صحافت کی تاریخ میں ہمیشہ اپنے سر اپنے ہاتھوں پر لیئے منصبِ صحافت کی سربلندی کے لیئے راہ، جنوں میں سرگرداں، ضمیرِ صحافت، ضمیر نیازی بھی یاد آئے، اور میں نے ضروری جانا کہ آج کی بات کا آغاز ان کی کچھ باتوں سے کیا جائے۔ ضمیر نیازی، ''ذرایع ابلاغ اور سماجی ذمہ داری'' کے عنواں کے تحت ایک مضمون میں لکھتے ہیں، ''۔۔ذرا اپنے گردوپیش پر نظر ڈالیئے۔۔خبریں اور خبرنامے تو بے خبری پھیلا رہے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں اطلاعات کی بھرمار ہے، لیکن علم مفقود ہے۔ درجنوں علوم پر روزانہ، تمام زبانوں میں، کروڑوں بلکہ اربوں لفظوں کی اشاعت کا عمل پورے کرہ ارض پر جاری ہے۔ لیکن آگہی مفقود ہے۔ ذرایع ابلاغ زیادہ زیادہ سے زیادہ اطلاعات، مگر کم سے کم معلومات فراہم رہے ہیں۔ یا یوں کہ لیجئے کہ:

Telling more and more about less and less

یہاں ٹی ایس ایلیٹ کا یک مقولہ بھی یاد آرہا ہے کہ:

Where is the wisdom we have lost in knowledge

Where is the knowledge we have lost in information

یوں علم اطلاعات کی بھول بھلیوں میں کہیں گم ہوکر رہ گیا ہے۔ ہمیں لفظ 'خبر' کے معنی پر پھر سے غور کرنا ہوگا۔ اس لفظ کے معنی ہیں: واقفیت، آگاہی، پیغام، پتا، سندیسہ، سراغ، نشان شدھ بدھ، ہوش مندی، ہشیاری، احوال، اعلان، اطلاع، حدیث، شہرت، کسی واقعہ کو ظاہر، عیاں، یا آشکار کرنا۔ ''خبر کے ساتھ ایک اور لفظ بھی نتھی ہے، جسے ''افواہ'' کہتے ہیں۔ یہ لفظ بھی غور طلب ہے۔ پوری دنیا میں آج کل جو لاکھوں ٹنوں کاغذ صرف ہو رہا ہے، ریڈیو اور ٹی وی پر جو الفاظ بولے جا رہے ہیں، ان میں خبر کو دو الفاظ میں قید کر دیا گیا ہے: اطلاع (Information)، اور افواہ (Speculation)۔ یہی وجہ ہے کہ خبر سے علم اور آگہی غائب ہو چلے ہیں۔

موجودہ دور کا ایک بڑا المیہ یہ ہے کہ ہم نے علم کو خانوں میں تقسیم کر دیا ہے، اس عمل کا نام Specialization ہے۔ ہر شخص اپنے میدان کا اسپیشلسٹ ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہر شخص یک رخا ہوکر رہ گیا ہے۔ علوم کہ علاوہ یہ معاملہ زبانوں کا بھی ہے۔ وہ دور گزر گیا جب سندھ کی سرزمین پر شاعرِ ہفت زبان سچل سرمست کے نغمہ گونجا کرتے تھے۔ دور کیوں جایئے، ہم نے اپنے شاعرِ مشرق پر سینکڑوں کتابیں اور ہزاروں مضمون لکھوا دیئے، لیکن ہمیں یہ یاد نہیں رہا کہ ان کے پیغام کا ساٹھ فی صد حصہ یعنی ان کا فارسی کلام ایسا ہے جسے نہ تو ہم صحیح طرح پڑھ سکتے ہیں، اور نہ سمجھ سکتے ہیں۔ اس لیئے کہ ہم سب یک رخے ہوکر رہ گئے ہیں۔

جب منظر نامہ ہی یک رخا ہو جائے تو تو نظر بھی محدود ہو جاتی ہے۔ تصویر کا صرف ایک ہی رخ دکھائی دیتا ہے، اور وہ بھی ادھورا۔ نام نہاد ماہرین اپنے ہی محدود علم کی روشنی میں ان واقعات اور حادثات کا جائزہ لینے پر مجبور ہو جاتے ہیں، جن کے عوامل اور محرکات کو سمجھنے کے لیئے ایک سے زیادہ علوم پر دسترس ہونا ضروری ہے۔ اور یہ بات ظاہر ہے کہ محدود علم اور محدود مشاہدے، محض محدود اطلاع اور محدود تجزیئے کو جنم دے سکتے ہیں، اور اس کے نتیجہ میں حقائق مسخ ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ اخبارات کے کالم خبروں، جائزوں، اور تجزیوں سے پر ہوتے ہیں۔ یہی اخبارات کا مقصد بھی ہے۔ لیکن ذرا غور کیجئے، ماسوا چند ایک کے، یہ سب تحریریں لفظوں کے گورکھ دھندے سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔ متفرق خیالات کے ربط اور ترتیب سے جو علم، آگہی، اور بالغ نظری پیدا ہوتی ہے، وہ سرے سے غائب ہے۔ خبروں کی اس بھرمار میں نہ صرف ہم بے خبر ہیں بلکہ دوسرا بڑا ظلم بڑی ناانصافی یہ ہو رہی ہے کہ نصف صدی کے بعد وہ مورخ کیا تاریخ مرتب کر سکے گا جس کا دارومدار آج کے اخباروں، جریدوں، اور کتابوں پر ہوگا۔ ہر مورخ کو اسی خام مواد سے اپنی تعمیر کرنی ہوتی ہے۔ جب خام مواد ہی ناقص اور ناقابلِ اعتبار ہوگا تو عمارت کی ساخت اور ساکھ کیا ہوگی۔ یہ ہم سب پر عیاں ہے''۔

مندرجہ بالا سطور میں ضمیر نیازی کے اس طویل حوالے کا بنیادی مقصد، اس معیار، ذمہ داری، اور منصب کا تعین کرنے میں مدد حاصل کرنا ہے کہ جو سالہا سال سے کالم نگاروں کو نشانِ منزل دکھا رہا ہے۔

کالم نگاری کے منصب کو سمجھنے کے لیئے ہمیں یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ ہم اس کو بیانیہ یا narrative کی کس صنف میں گردانتے ہیں، اور اس بیانیہ کے معیار اور حدود و قیود کیا ہیں۔ غور کریں تو پتہ چلتا ہے کہ اکثر کالم پیشہ ور صحافی لکھتے ہیں، جنہوں نے باقاعدہ طور پر صحافت کی پیشہ ورانہ تعلیم حاصل کی ہوتی ہے۔ یہ کالم ظاہر ہے کہ صفِ صحافت میں شامل ہیں۔ اخباری کالموں کی مختلف اقسام ہیں، جن میں اداریئے، آرا، سیاسی تبصرے، کتابوں کے جائزے، فلمی جائزے، مذہبی مضامین، معاشی افکار، طرزِ زندگی پر تبصرہ، اور بے شمار موضوعات شامل ہیں۔ اخباروں میں چھپنے والے تقریباً سب کالم نگاروں کو حروف کی تعداد کی پابندی کرنا ہوتی ہے۔ آج کل بالعموم کالم میں حروف کی تعداد سات سو سے آٹھ سو تک

محدود ہوگئی ہے۔اور صرف وہ کالم نگار ہی بڑا کالم نگار سمجھا جاتا ہے ہے جسے مختصر نگاری پر عبور ہو۔

کالم نگاری پر ایک اہم کتاب، The art of Column Wrtinting میں کالم نگاری سے متعلق وہ نکات بیان کیئے گئے ہیں جن کو مدِ نظر رکھتے ہوئے عمدہ کالم نگار منفرد طور پر پہچانے جاتے ہیں اور اکثر اعزاز و انعام کے بھی مستحق قرار دیئے جاتے ہیں۔ان اہم نکات میں ،مضبوط اور با حوالہ دلیل ،علم اور روشن خیالی ،منفرد نقطہء نظر ، ربطِ فکر ، واضح خیالات ،ایک عمدہ کہانی ،معروضی تنقید ،جذبات کی وسعت ،نئی آواز ، پیشہ ورا خلاقیات ،اور صحافت کے قوانین کی پابندی شامل ہیں۔

جو باتیں کسی کالم کو کم تر یا اسفل درجہ پر لے جاتی ہیں ان میں ،پھسپھسا پن ، اکتاہٹ پیدا کرنے والے خیالات ،گھسی پٹی ترکیبیں اور الفاظ ،کالم نگار کا جا بجا اپنی ہی ذات کا حوالہ ، پر دلیل رائے کا فقدان ،مستند حوالوں کی غیر موجودگی ، غیر معیاری زبان کا استعمال اور بازاری نعرہ بازی شامل ہیں۔

کالم نگاروں کی صفوں میں پیشہ ور صحافیوں کے علاوہ وہ ادیب اور مصنف بھی شامل ہوتے ہیں جو کسی دیگر شعبہ میں امتیاز رکھتے ہوں۔اس قسم کی تحریروں کو اب ''تخلیقی غیر افسانوی ادب'' کی صنف قرار دیا جارہا ہے۔ اس صنف کو اختیار کرنے والوں میں بڑے ادیب ، دانشور ، اور اصحابِ رائے شامل ہیں۔مغرب میں ان معروف ناموں میں ، جورج اورویل ، چارلس ڈکنز ، ڈینیل ڈیفو ، ٹوم ولف ، آرک بکوالڈ ، فرید ذکریا ، اور ایسے ہی بے شمار بڑے نام شامل ہیں ، ہمارے لیئے ان میں سامنے کا نام آرک بکوالڈ کا ہے جس نے اپنی زندگی میں کم از کم دس ہزار سے زیادہ کالم تحریر کیئے۔ہم یہ بات بلا خوفِ تردید کہہ سکتے ہیں کی ان مصنفین نے کالم نگاری ، اور صحافت کو جس درجہ پر پہنچایا اور جو معیار متعین کر دیئے ان تک پہنچنے کی خواہش ہر نئے یا تجربہ کار کالم نویس کے ذہن میں ہمہ دم موجود رہتی ہے۔

خود اردو زبان اور پاکستان کی کالم نگاری کے معیار متعین کرنے والوں میں ابوالکلام آزاد ، چراغ حسن حسرت ، مجید لاہوری ، ابراہیم جلیس ، طفیل احمد جمالی ، منو بھائی ، احمد ندیم قاسمی ، ابراہیم جلیس ، ابنِ انشا ، مشفق خواجہ ، شوکت تھانوی ، کشور ناہید ، زاہدہ حنا ، نسیمہ بنتِ سراج ، کے نام سرِ فہرست ہیں۔

میری رائے میں پاکستان اور اردو زبان سے تعلق رکھنے والا کوئی بھی کالم نگار مندرجہ بالا مصنفین کے طے کردہ معیاروں تک پہنچے بغیر ، کبھی بھی بڑا کالم نگار نہیں گردانا جائے گا۔اگر وہ ان کے معیاروں سے انحراف کرنا چاہے گا جو اس کا حق ہے تو اس پر لازم ہوگا کہ وہ ان طے شدہ حدود کو کسی بلند تر جست سے عبور کر کے اپنا نیا معیار متعین کروائے۔

میں اس موقع مناسب سمجھتا ہوں کہ پاکستان اور اردو کے ایک ممتاز ترین کالم نگار ''نصر اللہ خان'' کے اس انٹرویو سے استفادہ کروں جو انہوں نے ۱۹۸۳ میں ڈاکٹر طاہر مسعود کو دیا تھا ، یہ انٹرویو طاہر مسعود کے مجموعہ ''یہ صورت گر کچھ خوابوں کے'' میں شامل ہے۔

نصر اللہ خان سے سوال کیا گیا کہ ''ایک اچھے کالم کی کیا پہچان ہے؟ یعنی اس میں کیا خوبیاں ہونی چاہیئں؟ انہوں نے کہا کہ '' کلام کی سب سے بڑی خوبی یہ ہونی چاہیئے کہ آپ اس کے ذریعہ اپنے ملک وقوم کے مسائل کو حل کرنے میں لوگون کی اس طرح مدد کریں کہ وہ سوچنے سمجھنے ، اور کچھ کرنے کے لیئے تیار ہو جائیں ۔۔۔لطیفے اور الفاظ سے کھیلنا ، کسی کی محرومی کا مذاق اڑانا نہ کالم نویسی کے احاطہ میں آتا ہے اور نہ صحافت کے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب میں نے ایک بار شوکت تھانوی کا کسی معذور شخص کے بارے میں لکھا ہوا یہ خاکہ پڑھا کہ وہ یوں لنگڑا لنگڑا کر چلتے تھے جیسے ٹائپ کرتے ہوں۔اس دن سے میں نے شولت تھانوی کو پڑھنا چھوڑ دیا۔دوسری بات یہ ہے کہ کالم نگار کو اپنی ذات کو مار کر لکھنا پڑتا ہے۔ کالم نگار کو بے غرض ہونا چاہیے۔اس کا مطلب ہے کہ کلام نگار اپنا امیج نہیں بنائے۔

نصر اللہ خان سے سوال کیا گیا کہ '' کالم نگاری کو ادب کی صنف تسلیم نہیں کیا جاتا۔ادیب کالم نگاری کو سطحی ، چلتا ہوا اور صحافتی مشغلہ شمار کرتے ہیں ، اور یوں اس کی اہمیت کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔آپ ادیبوں کے ان خیالات کو کتنی اہمیت دیتے ہیں۔اور آپ کے پاس اس کے جواب میں کہنے کے لیئے کیا ہے؟

انہوں نے جواب میں کہا'' یہ کالم نگار پر منحصر ہے کہ وہ اپنے کالم کو چلتا ہوا کام بنادے یا ہیرے کی طرح تراش کر رکھ دے۔ ہمارے پاس وقت کم ہوتا ہے اور عجلت میں لکھنا پڑتا ہے۔لیکن اس کے باوجود کئی ایسی چیزیں لکھ دی جاتی ہیں جو ادبی شہ پارے پر بھاری ہوتی ہیں۔کالم نویسی ادب کا حصہ ہے ، صحافت کا ہر صفحہ تاریخ ہے۔آپ معاشرے اور حلاتِ زندگی پر لکھتے ہیں۔اگر موضوع پر آپ کے لکھنے کا طریقہ ادیبانہ ہے تو اسے یقیناً ادب سمجھا جائے گا۔ ہر کالم ادب کا حصہ نہیں ہے۔جیسے ہر غزل ادب کا حصہ نہیں ہے۔اس کا دارومدار وقت ، موضوع اور لکھنے والے کی شخصیت پر ہوتا ہے۔اودھ پنچ میں جو کچھ چھپتا تھا ، رتن ناتھ سرشار کا فسانہء آزاد جو اخبار میں چھپتا تھا ، آپ کیا انہیں ادب کا حصہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیں گے؟ اسی طرح میر محفوظ علی ، اور قاضی عبدلغفار ، عبدالمجید سالک ، چراغ حسن حسرت ، اور ظفر علی خاں کی تحریروں کو کیا نام دیں گے۔ جو بہر حال ادب میں شامل ہیں۔لکھنے والا ادیب ہے تو پھر کالم بھی ادب میں شمار ہوگا۔نصر اللہ خان سے سوال کیا گیا کہ ،'' کیا آپ لکھنے والوں کے پی آر کے رویئے کو با جواز سمجھتے ہیں؟ جواباً انہوں نے کہا'' میں اس رویے کو کبھی بھی درست نہیں سمجھتا۔خدا جانے لوگ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ بعض لوگ اپنی پبلسٹی کو ضروری تصور کرتے ہیں۔ان کا خیال ہے کہ جو کچھ انہوں نے لکھا ہے پبلسٹی سے اس میں زور پیدا ہو جائے گا۔میرا خیال اس کے برعکس ہے۔ پھر ہنس کر بولے '' آدمی اپنے ساتھ شام منانا چاہتا ہے تو شامِ غریباں منائے۔

دس ہزار سے بھی زیادہ کالموں کے مصنف اور متعدد بار بہترین کالم نویس کا اعزاز حاصل کرنے والے نصر اللہ خان سے پوچھا گیا کہ '' آپ کے کالموں کا مجموعہ ...

منظرِ عام پر آیا اور اس کہ باوجود کہ بہت اچھا مجموعہ تھا، نہایت خاموشی سے گزر گیا، اس کا وہ شہرہ نہ ہو سکا، جس کا وہ مستحق تھا۔ آپ اس کے اسباب پر روشنی ڈالیں گے۔ انہوں نے جواب میں کہا، ''میرے کالموں کے مجموعے کی ایک ہزار کاپی چھپی تھی۔ اس میں بیس سال کے کالموں کا انتخاب کیا گیا تھا۔ لیکن میں اس انتخاب سے مطمئن نہیں ہوں۔ پھر یہ کہ مجھے کوئی پبلشر بھی نہیں ملا۔ حالانکہ میں تو اس پر بھی تیار تھا کہ پبلشر مجھے ایک پیسہ نہ دے لیکن کتاب ڈھنگ سے چھاپ کر عام آمی تک پہنچا دے۔ لیکن یہ سب نہ ہو سکا۔

کالم نگاری کی ضمن میں طاہر مسعود کا اردو کے ممتاز محقق اور دانشور مشفق خواجہ سے یہ سوال اور اس کا جواب بھی توجہ طلب ہے، ''پاکستان اور ہندوستان کے ادبی حلقے اور اخبارات کے ادبی صفحات کے قارئین کی ایک بڑی اکثریت ''خاموش بگوش' نامی ایک کالم نگار سے واقف ہے، جس کے ادبی کالم کا انتظار کیا جاتا ہے۔ اور جس کا ہر کالم ایک نئے تنازعے کا باعث بنتا ہے۔ بہت سے لوگوں کو یقین ہے کہ خامہ بگوش آپ ہی ہیں۔ اگر یہ درست ہے تو آپ بتانا پسند کریں گے کہ آپ نے اپنا نام پوشیدہ رکھ کر ایک قلمی نام اختیار کرنے کی ضرورت کیوں محسوس کی۔؟'' جواب میں مشفق خواجہ نے کہا کہ ''اصل میں کالم نگاری میرا میدان نہیں ہے۔ یہ میرا مقصد اور میری منزل نہیں ہے۔ میں قلمی نام سے اس لیئے لکھتا ہوں کہ ہمارے ہاں فرضی ناموں سے لکھنے کی ایک طویل روایت ملتی ہے۔ احمد ندیم قاسمی صاحب سالہا سال تک 'عنقا' کے عنوان سے لکھتے رہے۔ مولانا چراغ حسن حسرت نے سند باد جہازی کے نام سے کالم نویسی کی۔ ابنِ انشا نے کم از کم نو فرضی ناموں سے کالم لکھے، اور پطرس بھی فرضی نام تھا جو بالآخر اصل نام کا جزو بن گیا۔ قلمی نام اختیار کرنے کی وجہ یہ بھی تھی کہ طنز و مزاح کے کلام میں بعض چیزوں کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہوتا ہے۔ اصل نام سے لکھنے میں یہ خرابی ہے کہ لوگ اس پر غور نہیں کرتے کہ کیا لکھا گیا ہے بلکہ اس پر توجہ دینے لگتے ہیں کہ کس نے لکھا ہے۔ چوں کہ میرے پیشِ نظر مقصد اہم تھا اس لیئے میں نے فرضی نام اختیار کیا۔ اب یہ میری بدقسمتی ہے کہ کالموں کی اشاعت کے بعد لوگ اس تحقیق میں پڑ گئے کہ لکھنے والا کون ہے۔۔۔ جن ادیبوں کے متعلق میں کالم لکھے ان میں بعض بہت حساس تھے۔ ان کا یہی خیال تھا کہ میں نے کسی وجہ سے ان کے خلاف کالم لکھے۔۔۔ میں نے تقریبِ رونمائی کے خلاف بہت کچھ لکھا ہے کیوں کہ میں دیانت داری سے اسے ادب اور ادیب کے حق میں مضر سمجھتا ہوں۔''

مشفق خواجہ ''خامہ بگوش کے قلم سے'' کے عنوان سے شایع ہونے والے اپنے کالموں کے مجموعہ میں لکھتے ہیں، ''کالموں کا انتخاب شایع کرنے کا ہمارا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ کیونکہ ہمارا خیال ہے کہ جس معاشرہ میں سبھی صاحبِ کتاب ہوں وہاں ایک آدھ کتاب خواں کا ہونا بھی ضروری ہے، تاکہ کتابوں کی اشاعت بے جواز نہ ٹھہرے۔۔۔ کالم نگاری ہم کئی سال سے کر رہے ہیں۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو ہمارے کالموں کی ضخامت ممتاز مفتی کے علی پور کے ایلی سے کم نہ ہوگی۔ اتنے بہت سے کالموں کا انتخاب کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔۔۔ ان کالموں کو ہم نے جمع کیا اور ان پر ایک نظر ڈالی۔ اندازہ ہوا کہ سبھی سراپا انتخاب ہیں بشرطیکہ نا قابلِ انتخاب کالموں کا مجموعہ چھاپنا ہو۔۔۔ اس مرحلے پر اردو کے منفرد نقاد مظفر علی سید نے ہماری دستگیری کی۔۔ ہماری حوصلہ افزائی کے خیال سے انہوں نے فرمایا، کوئی مصنف اپنی تحریر کا انتخاب خود نہیں کرتا، کیوں اسے اپنی ہر تحریر عالم میں انتخاب اور آپ کو کالم میں انتخاب نظر آتی ہے۔۔ میں یہ نہیں دیکھوں گا کہ اچھا کالم کونسا ہے اور برا کالم کون سا ہے۔ میں تو اس پر نظر رکھوں گا کہ کون سا کالم کم برا ہے اور کون سا زیادہ۔۔۔''

مجھے امید ہے کہ اب تک کے بیان کردہ مضمون سے آپ کو یہ اندازہ ہو گیا ہو کہ کالم نگاری کا منصب کیا ہے، اور کالم نگاری کیسی صحرا نوردی اور کیسا فرہادی تیشہ طلب کرتی ہے۔ جیسے کہ غالب نے کہا تھا کہ صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا۔

آپ اس امر سے بخوبی واقف ہوں گے کہ ایک مشاق اور تجربہ کالم نگار کے ذہن میں اس کے پڑھنے والے بھی ہوتے ہیں اور ایک ایسا نظریہء خیال بھی کہ جس کے ذریعہ وہ سماج میں بہتر تبدیلی کا خواہاں ہوتا ہے۔ میں نے جن پاکستانی کالم نویسوں کا ذکر کیا ان میں ضمیر نیازی آزادیٔ صحافت کے رہنما تصور کیے جاتے ہیں۔ وہ سخت جان لیوا کنسر میں مبتلا تھے جب انہیں بے نظیر بھٹو کی حکومت نے اعزاز سے نوازا تھا۔ انہوں نے اپنا سرکاری اعزاز اور اس سے منسلک رقم حکومت کو یوں لوٹا دیئے کہ اسی سال حکومت نے کئی اخباروں کے دفتروں پر شب خون مار کر پابندی لگائی تھی۔ ان ہی سطور میں پیش کردہ سب ہی نام پاکستان میں اور عالمِ اسلام میں آزاد خیالی اور روشن خیالی کے خواہاں اور عمل پرست تھے۔

اب مناسب ہوگا کہ میں محترمہ روبینہ فیصل کی کتاب سے چند اقتباسات آپ کو پیش کروں تاکہ آپ کو خود یہ فیصلہ کر پائیں کہ ان کی کاوش ان معیاروں تک کہاں تک پہنچی ہے، جو اوپر بیان کیئے گئے ہیں۔ اور اگر انہوں نے انحراف کیا ہے جو ان کا حق ہے تو انہوں نے ان معیارات سے آگے کی کیا حد قائم کی ہے۔ آپ ان اقتباسات میں کوئی نقطہء نظر بھی تلاش کر سکتے ہیں۔

مری زمیں کے لیئے تھا مثالِ ابرِ کرم میں وہ قائدِ اعظم میں لکھتی ہیں'' ۔(وہ) اپنے نوکر کے ساتھ کھڑے ہو کر نماز پڑھتے تھے۔'' پاک بھارت تعلقات کے بارے میں اپنے کالم 'یاد کیا تجھ کو دلائیں ترا پیماں جاناں' کے عنوان سے انہوں نے لکھا ہے، 'کیا کبھی بھارت اور پاکستان ایک دوسرے کے دوست ہو سکتے ہیں، سوچیئے۔۔ سب رسمی ہو ہا، سب ڈھول تماشوں کو سب ظاہری بینڈ باجوں کو چھوڑ کر بس سوچیئے سچے دل سے۔ اپنے خداؤں کو حاضر ناضر جان کر مان کر سوچیئے کیا ایسا ممکن ہے؟ میرا دل کہتا ہے نہیں!''' پاکستان اور انڈیا کے لوگوں میں تعصب کی جڑیں اتنی گہری ہیں کہ یہ کسی میرا کے بھارت جانے یا مہیش بھٹ کے پاکستان آنے سے ختم نہیں ہو سکتیں۔ انڈیا کی پاکستان کے خلاف بنی فلمیں دیکھ کر کوئی محبِ وطن، نارمل انسان اپنا بلڈ پریشر کنٹرول نہیں کر سکتا۔ جب تک کہ وہ انہی کی کسی اداکارہ کا اچھا سا رقص نہ دیکھ لے ... ہماری عوام پیار کرنے والی ہے اور سادہ دل ہے

وہ اندر نہ کمینگی پال سکتی ہے نہ کسی کی کمینگی آسانی سے سمجھ سکتی ہے۔۔۔مگر انڈیا کے اندر جو جڑوں تک پھیلا زہر ہے تعصب کا، حقارت کا، احساسِ کمتری یا حسد کا، چھوٹے بھائی کو کنوئیں میں پھینک کر باپ (امریکہ) اور پوری دنیا کو اس بھیڑ کے خون سے بھری قمیص دکھا کر جھوٹا ڈرامہ کرنے کا شوق۔''

آزادیء اظہار کے بارے میں اپنے کالم ''محبت آزادی مانگتی ہے'' میں روبینہ لکھتی ہیں، ''آزادیء اظہار، اس کا تانتا اپنے عالم فاضل بھائی بندوں کا اسلام اور پاکستان کے خلاف زہر اگلنے ہی پر کیوں ٹوٹتا ہے؟۔۔مگر یہ آزاد خیال، بڑے بڑے دانشور، انسانیت نواز، اپنی عقل سے دنیا کی آدھی سے زیادہ آبادی کا دل دکھانے کا باعث بنتے ہیں، اور پھر کہتے ہیں ہم انسانیت سے محبت کرتے ہیں۔۔یہ کیسی انسانیت ہے کہ جب آپ کا منہ کھلے لوگوں کا دل اندر سے ہل جائے، کیونکہ کبھی تو آپ ان کے پیارے مذہب کو، ان کے نبی کو۔ ان کے رب کو، ان کی ثقافت کو اور کبھی ان کی دھرتی ماں کو کوسیں۔۔۔۔اور یہ اپنے ہی عالم فاضل لوگ کہتے ہیں، گاندھی قائدِ اعظم سے بڑا لیڈر تھا اور بدھ مت اسلام سے بڑا مذہب ہے۔۔میں تو سمجھتی تھی صرف بچے اور کچے دماغ کے لوگ ہی اپنی چیزوں کو کمتر اور دوسروں کی چیزوں کو برتر خیال کرتے ہیں، مگر یہاں تو بڑے بڑے کئی کئی کتب کے مصنف اپنا دامن نوچتے نظر آتے ہیں۔۔۔۔۔

'بلوچستان کی آزادی کس سے۔ پنجاب سے؟' کے عنوان سے روبینہ لکھتی ہیں،''۔۔خیر بخش مری نے مسلح جدو جہد شروع کی اور اسے ختم کرنے کے لیئے پاکستان کی فوج کے تین چار سو فوجی شہید ہوئے اور سات ہزار تین سو علیحدگی پسند اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔نواب اکبر بگٹی بھٹو کے پورے دور میں بلوچستان کا گورنر بنا رہا مگر اسے کے منہ سے تب کبھی بلوچیوں کے حقوق کے لیے آواز نہیں نکلی۔۔۔۔رحیم الدین خان ضیاالحق کے زمانے میں مارشل گورنر آف بلوچستان بنا اور وہاں پنپنے والی سب آزادی کی تحریکوں کو اس نے کامیابی سے ختم کیا، ترقیاتی کام بھی اس کے دور میں ہوئے، اور پہلی دفعہ نوابوں، ذمہ داروں کو صوبائی اسمبلی سے دور رکھنے کی کوشش کی گئی۔اس کے زمانے میں چاغی میں نیوکلیئر تجربے ہوئے۔یعنی اس نے چاہے ڈنڈے کے زور پر ہی سہی کیونکہ سول اور آرمی دونوں طاقتیں اس کے پاس تھیں، بلوچستان میں علیحدگی پسندی جیسے خیالات ختم کیا اور محبّ الوطنی کو فروغ دینے کی کوشش کی۔ایک بلوچی کو پاکستانی ہونے کا احساس دلایا۔''

کینیڈا میں باپ اور بھائی باپ کے ہاتھوں قتل ہونے والی سولہ سالہ پاکستانی نژاد اقصیٰ پرویز کے بارے میں روبینہ کا کالم ''میرا اسلام ہی میرا مجرم ٹھہرا کے عنوان سے ہے۔ شہادتوں کے مطابق اقصیٰ کو اس لیئے قتل کیا گیا کہ وہ اپنے باپ کے جبر پر حجاب نہیں پہننا چاہتی تھی، اور کینیڈا میں عام مسلمان لڑکیوں کی طرح زندگی گزارنا چاہتی تھی۔ وہ لکھتی ہیں یہاں کا اور مغرب کا میڈیا (کسی ہندو صحافی کی خاص عنایت اس خبر میں ضرور شامل ہوتی ہے جس میں کسی پاکستانی مسلمان کا نام ہو)، جو بھی کرتا ہے۔۔دکھ اس وقت بڑھ جاتا ہے جب کوئی نام نہاد لبرل مسلمان اسکالر اپنی اپنی چونچیں کھولتے ہیں، اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک طرف تو ملا اور مولوی مذہب کے نام پر ایک اچھا خاص بزنس رن کرتے ہیں تو دوسری طرف ایسے برساتی مینڈک بھی ایسی کسی خبر پر پھدکتے بلوں سے نکل آتے ہیں۔۔۔مولوی کو حلوے کا لالچ اور اس لبرل اسکالر کو شہرت اور بلا وجہہ کی بیان بازی کا نادر موقع مل جاتا ہے۔۔۔جتنے مذہب کے لیئے قاتل ان پڑھ مولوی ہیں ان سے بڑھ کر یہ نام نہاد لبرل اسکالرز ہیں جو فوراً اسلام کی بنیاد پرستی پر لمبے لمبے کالم لکھ کر یہاں کے میڈیا میں ہندوؤں کے برابر مقام بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔۔۔۔اسلام ہمارے لیئے قابلِ فخر مذہب ہے اسے ہمارا فخر رہنے دیا جائے اسے ہر جرم کی وجہہ یا جرم کا پس منظر بنا کر نہ پیش کیا جائے تو اچھا ہوگا۔اسلام زندہ باد، نام نہاد جدید اسکالر مردہ باد۔اگر ہم مولوی سے خوش نہیں ہیں تو اس لبرل اسکالر سے باقاعدہ نفرت کرتے ہیں۔۔''اس اقصیٰ پرویز کے لیئے دعائے مغفرت۔۔۔ہم اقصیٰ پرویز کے لیئے جتنے بھی رنجیدہ ہو جائیں ہمارا غم اس باپ کے مقابلہ میں ذرہ برابر بھی نہیں جس نے اسے پالا پوسا، بڑا کیا، اور پھر نجانے کیوں اپنے ہی ہاتھوں مار دیا۔۔ہمارا غم اس کے سامنے کچھ نہیں ہے۔۔بے شک اس کا دکھ بہت بڑا ہے۔۔''

میں اپنے اس مضمون کو سمیٹتے ہوئے آخری حوالہ کے طور روبینہ فیصل کی کالم ''غدار تو نوازے جاتے ہیں'' سے ایک اقتباس پیش کرتا ہوں۔''Knighthood کا خطاب ''سر''۔۔ سراسر۔۔اور سر۔۔علامتی خطاب ہے۔۔۔سر کا خطاب انہیں دیا جاتا ہے جو کراؤن، ہیڈ آف اسٹیٹ کی نظر میں معتبر ہیں۔۔۔مگر جب شاہوں کے شاہ۔ colonies کے تھرڈ کلاس، تھرڈ ورلڈ کے باشندوں پر مہربان ہوتے ہیں، جب ان کو نوازنے کو دل مچلتا ہے، معیار ہوتا ہے صرف غداری، خالصتاً غداری۔۔۔اور برِصغیر کی اس وقت کی تاریخ اٹھا کر دیکھ لیں۔۔معتبر کون ہوتا ہے، میر جعفر جیسے کرداروں سے ہماری تاریخ زرد پڑی ہوئی ہے۔۔۔۔رشدی کو خطاب دینے میں بڑے بہانے ہیں، ملکہ برطانیہ کی اس میں کہیں پکڑ نہیں ہیں۔۔ٹائر جلائے جاتے ہیں، پتلے جلاتے ہیں، تصویریں پھاڑتے مسلمان ہر کیمرے کی آنکھ میں ہیں۔ٹکریں مارتے ہم ہی نظر آتے ہیں، ملکہ تو محل کے کسی تارک کونے میں آنکھوں پر پٹی باندھے، روشنی کو روکتے ہوئے سو رہی ہوگی، سر کا خطاب پانے والا سور ماکسی کھڈ میں گھس کر اپنی جان بچا رہا ہوگا۔۔۔۔۔

میں نے کالم نگاری کے معیار، جدید کالم نگاروں کے حوالے، اور روبینہ کی فیصل کتاب کی بقا اور پذیرائی کا معاملہ اب تک قارئین کی صوابدید اور حسنِ قرات پر چھوڑ دیا ہے اور کوئی قدری فیصلہ نہیں چنا ہے۔لیکن آخر میں محترمہ روبینہ فیصل کے لیئے ایک سوال چھوڑ رہا ہوں کہ اگر سر کا خطاب تیسری دنیا کے غداروں کو ملتا ہے تو ہم شاعرِ مشرق مفکرِ پاکستان علامہ سر محمد اقبال کو دیئے گئے ''سر'' کے خطاب ... کو جرات اور دیانت داری ... کے کس کھاتے میں لکھیں گے؟ جو علامہ نے جیتے جی کبھی واپس نہیں کیا